انتخابی عمل
قرآن و سنت اور آئین کی نظر میں

ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین ❁

ABSTRACT

This article focuses on the different aspects of electoral process in the light of Qur'ān and Sunnah. It supports the view that the Qur'ān and Sunnah give us the basic principles to make existing process harmonized with the spirit of Islam. In this regard, it elaborates the religious importance of establishing a government, its prerequisites and the basic rules for the Islamization of electoral process.

قیامِ حکومت کو عموماً ایک دنیوی عمل قرار دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے سیاست بھی ایک خالصتاً دنیوی عمل قرار پاتی ہے۔ جب بنیاد یہ بن جاتی ہے تو انتخابات، امیدواران کے کوائف، پارٹیوں کے منشور اور قانون سازی کا عمل سب کچھ ہی اپنی اصل اہمیت کھو کر کھیل تماشا بن جاتا ہے۔اس عاجزانہ کاوش میں حکومت سازی کے اس اہم عمل کا قرآن و سنت کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ ذیل میں حکومت سازی کے اہم پہلوؤں کو ایک ایک کر کے بیان کیا جاتا ہے:

قیامِ حکومت کی دینی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے معاشرے کا نظم و نسق چلانے کے لیے نظامِ حکومت قائم کرنے کے بارے میں واضح ہدایات ارشاد فرمائی ہیں، خود انسان کو بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں جو اعلان فرمایا وہ ﴿إِنِّي جَاعِلٌ

❁ سیکرٹری، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد (hikramulhaq@yahoo.com)

فِي ٱلۡأَرۡضِ خَلِيفَةٗ ﴾[1] (میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر بہت سے مفسرین سے منقول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے خلیفہ تھے اور ان کی ذمے داری اللہ تعالیٰ کے احکامات کو جاری کرنا اور نافذ کرنا تھا۔[2] قرآن مجید میں کئی ہستیوں کو حکومت دینے کا تذکرہ ان کے ناموں کے ساتھ وارد ہوا ہے، جیسے حضرت داوٗد علیہ السلام جنھیں اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ بادشاہت عطا فرمائی اور ان کو بھی اپنے خلیفہ کے لقب سے نوازا، اور حکم فرمایا کہ ﴿ يَٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلۡنَٰكَ خَلِيفَةٗ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَٱحۡكُم بَيۡنَ ٱلنَّاسِ بِٱلۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ ٱلۡهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ﴾[3] (اے داوٗد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمھیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی) حضرت سلیمان علیہ السلام کو حضرت داوٗد علیہ السلام کا جانشین بنایا اور ان دونوں حضرات کی حکومت کے کچھ امتیازات یوں بیان فرمائے ہیں:

﴿ وَدَاوُۥدَ وَسُلَيۡمَٰنَ إِذۡ يَحۡكُمَانِ فِي ٱلۡحَرۡثِ إِذۡ نَفَشَتۡ فِيهِ غَنَمُ ٱلۡقَوۡمِ وَكُنَّا لِحُكۡمِهِمۡ شَٰهِدِينَ * فَفَهَّمۡنَٰهَا سُلَيۡمَٰنَۚ وَكُلًّا ءَاتَيۡنَا حُكۡمٗا وَعِلۡمٗاۚ وَسَخَّرۡنَا مَعَ دَاوُۥدَ ٱلۡجِبَالَ يُسَبِّحۡنَ وَٱلطَّيۡرَۚ وَكُنَّا فَٰعِلِينَ * وَعَلَّمۡنَٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوسٖ لَّكُمۡ لِتُحۡصِنَكُم مِّنۢ بَأۡسِكُمۡۖ فَهَلۡ أَنتُمۡ شَٰكِرُونَ * وَلِسُلَيۡمَٰنَ ٱلرِّيحَ عَاصِفَةٗ تَجۡرِي بِأَمۡرِهِۦٓ إِلَى ٱلۡأَرۡضِ ٱلَّتِي بَٰرَكۡنَا فِيهَاۚ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيۡءٍ عَٰلِمِينَ * وَمِنَ ٱلشَّيَٰطِينِ مَن يَغُوصُونَ لَهُۥ وَيَعۡمَلُونَ عَمَلٗا دُونَ ذَٰلِكَۖ وَكُنَّا لَهُمۡ حَٰفِظِينَ * ﴾[4]

(اور داوٗد اور سلیمان، جب وہ ایک کھیتی کے مقدمے کا فیصلہ کرنے لگے، جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے، تو ہم نے فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا۔ اور ہم نے دونوں کو حکم (یعنی حکمت و نبوت) اور علم بخشا تھا اور ہم نے پہاڑوں کو داوٗد کے ساتھ تابع فرمان بنا دیا تھا کہ ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور جانوروں کو بھی، اور ہم ہی ایسا کرنے والے تھے۔ اور ہم نے تمہارے لیے ان کو ایک قسم کا لباس بنانا بھی سکھا دیا تا کہ تم

۱- البقرۃ: ۳۰

۲- ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی، **الجامع لأحکام القرآن**،(ت ۶۷۱ھ)، تحقیق: سمیر البخاری، ریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۲۳ھ - ۲۰۰۳ء، تفسیر البقرۃ: ۳۴، ج۱، ص ۲۶۳

۳- ص: ۲۶

۴- الأنبیاء: ۷۸-۸۲

کو لڑائی سے بچائے۔ اب تم کو شکر گزار ہونا چاہیے۔ اور ہم نے تیز ہوا سلیمان کے تابع کر دی تھی جو ان کے حکم سے اس ملک میں چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دی تھی اور ہم ہر چیز سے خبر دار ہیں۔ اور شریر جنات میں سے بعض ان کے لیے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے)

اور قرآنِ مجید نے جناب ذوالقرنین کی بادشاہی کا ذکر یوں فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِى ٱلْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُوا۟ عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا * إِنَّا مَكَّنَّا لَهُۥ فِى ٱلْأَرْضِ وَءَاتَيْنَٰهُ مِن كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا * ﴾[5] (اور تم سے ذوالقرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ میں اس کا کسی قدر حال تمھیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ ہم نے اس کو زمین میں بڑی دست رس دی تھی اور ہر طرح کا سامان عطا کیا تھا)۔ جناب طالوت کو حکومت دینے کا ذکر یوں فرمایا: ﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ٱللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا۟ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ ٱلْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِٱلْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ ٱلْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُۥ بَسْطَةً فِى ٱلْعِلْمِ وَٱلْجِسْمِ ۖ وَٱللَّهُ يُؤْتِى مُلْكَهُۥ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴾[6] (اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیوں کر ہو سکتا ہے؟ بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کو تم پر فضیلت دی ہے اور منتخب فرمایا ہے اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور جسمانی قوت بھی دی ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بادشاہی بخشے۔ وہ بڑا وسعت والا اور دانا ہے)۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِى ٱلْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَآءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴾[7] (اسی طرح ہم نے یوسف کو ملک میں جگہ دی اور وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔ ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے)۔ بنی اسرائیل کو مسلسل نبوت اور بادشاہی کا اعزاز بخشے رکھا جس کا تذکرہ موسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں فرمایا: ﴿ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَٰقَوْمِ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ

۵- الکہف: ۸۳-۸۴

۶- البقرۃ: ۲۴۷

۷- یوسف: ۵۶

جَعَلَ فِيكُمْ أَنۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَءَاتَىٰكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾[۸] (اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسان کیے ہیں ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیا پیدا کیے اور تمھیں بادشاہ بنایا اور تم کو اتنا کچھ عنایت کیا کہ اہلِ عالم میں سے کسی کو نہیں دیا۔) یہ چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح بہت سی آیات میں حکومت کرنے کے اصول وضوابط بتلا کر یہ واضح کر دیا گیا کہ معاشرے میں حکومت کا قیام اللہ تعالیٰ کی منشا کے عین مطابق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں اِسلامی معاشرے کے قیام کے لیے تیرہ برس رات دِن محنت فرمائی، مگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ معاشرہ مدینہ منورہ میں جا کر قائم ہوا، جوں ہی اِسلامی معاشرے کے قیام کی راہ ہموار ہوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں حکومت قائم فرمادی اور میثاقِ مدینہ کے ذریعے یہ واضح کر دیا کہ اسلامی حکومت کا مطلب اللہ کی زمین پر اس کا نظام قائم کرنا ہے اور اس کا نظام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ جو لوگ اپنی مرضی سے مسلمان نہ ہوں اور اِسلامی ریاست کے شہری کے طور پر رہنا چاہیں ان کو مکمل مذہبی آزادی اور بہ طورِ شہری مکمل تحفظ حاصل ہو گا۔ اسی میثاقِ مدینہ کو عصرِ حاضر کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے *The first written constitution in the world* کے نام سے انگریزی ترجمے کے ساتھ چھاپا ہے۔[۹] عام طور پر شریعت نافذ کرنے کا نام آتے ہی یہ الزام ناحق دہرایا جاتا ہے کہ اس سے غیر مسلموں کے حقوق محفوظ نہیں رہیں گے، مگر شریعت کسی جذباتی انسان کا بنایا ہوا قانون نہیں، بلکہ رب العالمین کا بنایا ہوا قانون ہے جو ماننے والوں کے حقوق کا تحفظ بھی کرتا ہے اور نہ ماننے والوں کے حقوق کا بھی بہ شرطے کہ وہ خود علمِ بغاوت بلند نہ کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرے کے رہ نماؤں کے اوصاف بیان فرما دیے، اسی طرح حکومت کے قیام کی تاکید بھی فرمادی۔ اس کے بارے میں متعدد احادیث ملتی ہیں جن میں سے مثال کے طور پر ایک حدیث یہ ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت میں منقول ہے: ”مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.“[۱۰] (جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت بھی نہ تھی تو وہ جاہلیت کی موت مرا)۔ سیاست دین سے الگ نہیں، بلکہ معاشرے کے نظام کو اللہ تعالیٰ کے حکموں کے

۸- المائدۃ: ۲۰

۹- لاہور، فیروزسنز

۱۰- مسلم بن حجاج، **صحیح مسلم**، کتاب الإمارة، باب الأمر بلزوم الجماعة عند ظهور الفتن وتحذير الدعاة إلى الكفر، حديث: ۱۸۴۸

مطابق چلانا اور اس کے لیے ضروری انتظامات کرنا یہی سیاست ہے، ایک اسلامی معاشرے میں سیاست ایک دینی فریضہ ہے۔ مشہور مسلم فقیہ ابو الحسن ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "الْإِمَامَةُ: مَوْضُوعَةٌ لِخِلَافَةِ النُّبُوَّةِ فِي حِرَاسَةِ الدِّينِ وَسِيَاسَةِ الدُّنْيَا، وَعَقْدُهَا لِمَنْ يَقُومُ بِهَا فِي الْأُمَّةِ وَاجِبٌ بِالْإِجْمَاعِ."[11] (امامت یعنی حکومت دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست میں نبوت کی خلافت کے طور پر جاری کی گئی ہے، اور امت میں اس کا قیام بالاجماع واجب ہے۔) مفکرِ پاکستان علامہ اقبال بھی یہی سوچ رکھتے تھے:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

امیدواروں کی بنیادی اہلیت

قرآنِ مجید میں مسلم معاشرے کے حکومتی مناصب کی عمومی اہلیت ایمان اور عملِ صالح کو قرار دیا گیا ہے، چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ كَمَا ٱسۡتَخۡلَفَ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِمۡ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِينَهُمُ ٱلَّذِي ٱرۡتَضَىٰ لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّنۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ أَمۡنٗاۚ يَعۡبُدُونَنِي لَا يُشۡرِكُونَ بِي شَيۡـٔٗاۚ وَمَن كَفَرَ بَعۡدَ ذَٰلِكَ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَٰسِقُونَ ﴾[12] (اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی بجالائیں گے تو وہ انھیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی، اور انہیں وہ دین نافذ کرنے کی توفیق دے گا جو اس نے خود ان کے لیے پسند کیا، اور یوں یقیناً وہ ان کے خوف زدہ ہونے کے بعد انھیں امن عطا کرے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے گا تو یہی لوگ فاسق ہوں گے)۔

یہ مسلم معاشرے کی حکومت کے انتخاب اور ان کی ذمے داریوں کا بہت واضح نقشہ ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ایمان اور عملِ صالح کو خلافت کے لیے اہلیت قرار دیا گیا ہے، اور اس اہلیت کو ہمیشہ مسلم معاشرے میں حکومت کے قیام کا اصول بتایا ہے خواہ وہ مسلم معاشرہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ہو یا ان سے پہلے بنی اسرائیل کا ہو۔ یہ خلافت اگر ان اصولوں پر ٹھیک طرح سے استوار ہو گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا، کہ اللہ کا دین نافذ ہو گا،

۱۱- ابو الحسن علی بن محمد ماوردی، الأحكام السلطانية، قاہرہ، دار الحديث، ج۱، ص ۱۵

۱۲- النور: ۵۵

بالکل وہ دین جسے اللہ نے پسند کیا ہے اور دوسرا بڑا کام یہ ہوگا کہ خوف جاتا رہے گا یعنی دہشت یا دہشت گردی نہیں رہے گی اور امن کا دور دورہ ہوگا۔ اس سے تیسری بڑی تبدیلی یہ آئے گی کہ سب لوگ بلا شرکت اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں گے، انہیں جگہ جگہ سر جھکانا نہیں پڑے گا۔ جب تک یہ نظام رہے گا ملک کا یہی نقشہ ہوگا۔ اگر اس نقشے میں تبدیلی آگئی یا کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو یہ لوگ فاسق ہوں گے اور فسق جتنا بڑھتا جائے گا دین غائب ہوتا جائے گا اور امن برباد ہوتا جائے گا۔

عملِ صالح صرف نماز روزے کا نام نہیں بلکہ دین و دنیا میں تفریق پیدا کیے بغیر ہر کام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق چلانا عملِ صالح ہے، خواہ وہ عبادت ہو یا معاشرے کے فلاحی کام یا حقوق العباد کی ادائگی، ان سب کاموں میں فرق کرنے اور کچھ کو کرنے، کچھ کو چھوڑنے سے تباہی آتی ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ بات بہت صاف بتائی گئی ہے کہ جنھیں ہم حکومت دیں ان کا فرض ہے کہ نماز قائم کریں، زکات ادا کریں، امر بالمعروف کریں اور نہی عن المنکر کریں، ارشادِ خداوندی ہے: ﴿ ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّٰهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُواْ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَنَهَوۡاْ عَنِ ٱلۡمُنكَرِۗ وَلِلَّهِ عَٰقِبَةُ ٱلۡأُمُورِ ﴾[۱۳] (یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دست رس دیں تو نماز پڑھیں اور زکات ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے)۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں دین و دنیا کے سب معروفات اور منکرات شامل ہیں اور زمین میں اقتدار دے کر ان باتوں کے قائم کرنے کا مطلب ان کا نظام قائم کرنا ہے۔ اس کی مثالیں قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ حکومت بنانے کے لیے یہ اہلیت صرف اس امت کے لیے نہیں بلکہ اس سے پہلی امتوں کے مسلمانوں کو حکومت اسی اہلیت کی بنیاد پر دی گئی۔ یہاں پہلی امتوں سے قریب تر مراد بنی اسرائیل ہیں۔ قرآنِ مجید بتاتا ہے: ﴿ يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَنِّي فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾[۱۴] (اے اولادِ اسرائیل ہم نے تمہیں دنیا جہان کے لوگوں پر فضیلت دی)۔ چناں چہ حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کو بادشاہ بنایا اور اسی طرح شام کے جابروں کو ہٹا کر ان کی جگہ انہیں وہاں کا بادشاہ بھی بنایا اور سکونت بھی دی (تفسیر طبری) مگر وقت گزرنے کے ساتھ جب وہ دین کے معاملے میں سست پڑ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی زیر قیادت ارضِ مقدس کی طرف جانے والے لشکر میں بنی اسرائیل پیچھے

۱۳- الحج: ۴۱

۱۴- البقرۃ: ۴۷

ہٹ کر بیٹھ رہے اور موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ جاؤ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو تو اس موقع پر موسی علیہ السلام نے انہیں ان کا اصل مقام یوں یاد دلایا: ﴿ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَٰقَوْمِ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَءَاتَىٰكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾[۱۵] (اے مری قوم! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب اس نے تمہارے اندر سے لوگوں کو نبی بنایا اور تم لوگوں کو بادشاہ بنایا، اور تمھیں وہ کچھ دیا جو تمام جہانوں میں کسی کو نہیں دیا)۔ مگر جب انھوں نے اس کی اہلیت کھودی تو نہ صرف یہ کہ انھیں حکومتوں سے محروم کر دیا، بلکہ ان کی شکلیں بھی مسخ ہوئیں، جن میں سے کچھ کو خنزیر، کچھ کو بندر اور کچھ کو طاغوت کے پجاری بنا دیا گیا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ ٱللَّهِ ۚ مَن لَّعَنَهُ ٱللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ ٱلْقِرَدَةَ وَٱلْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ ٱلطَّٰغُوتَ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَآءِ ٱلسَّبِيلِ ﴾[۱۶] بندر اور خنزیر بننے والے تو جلد ہی مر گئے مگر طاغوت کے پجاریوں کو صدیوں تک طاغوت کے سامنے سجدہ ریز رہنا پڑا۔ ایک زمانہ تھا کہ یوسف علیہ السلام غلام بن کر مصر میں آئے تھے مگر ان کے ایمان اور عمل صالح کی بنا پر انہیں وہاں حکومت ملی اور اس کے چند ہی صدیوں بعد جب موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تو وہی قومِ بنی اسرائیل فرعون کی پوجا بھی کرتی تھی، ان کی عورتیں فرعونیوں کے گھروں میں خدمت کرتی تھیں اور انھیں کسی طرح کے انسانی حقوق بھی حاصل نہیں تھے۔ مسلم معاشرے میں حکومتی منصب کا اہل وہی ہو سکتا ہے جو دین کے تقاضوں کے مطابق نظامِ حکومت چلا سکے۔ گذشتہ امتوں کے مسلم معاشرے کی حکومتیں تب ختم ہوئیں جب وہاں کے لوگوں میں دو انتہائیں رواج پا گئیں۔ ایک طرف حکم رانوں نے برائیوں کی انتہا کر دی اور دوسری طرف ان سے تنگ آئے شرفا نے معاشرے کو چھوڑ کر رہبانیت اپنالی۔ یہ کام بڑھتے بڑھتے ان کی حکومتوں کے خاتمے کا سبب بنے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ٱبْتَدَعُوهَا ﴾[۱۷] کے تحت لکھا ہے: "ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب بادشاہوں نے تین سو سال تک حرام کام جاری رکھے تو جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے طریقے پر قائم تھے، انھوں نے اس رویے کے خلاف آواز اٹھائی تو اقتدار والوں نے انھیں قتل کر دیا۔ جو لوگ قتل ہونے سے بچ گئے انھوں نے کہا کہ اگر ہم انھیں روکنے کی کوشش کریں گے تو یہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے، اس لیے ہمارے ان

۱۵- المائدۃ: ۲۰

۱۶- المائدۃ: ۶۰

۱۷- الحدید: ۲۷

کے درمیان رہنے کی کوئی گنجائش نہیں چناں چہ یہ لوگوں سے الگ تھلگ ہوگئے اور انھوں نے چلہ گاہیں بنالیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: انھوں نے عورتوں سے بھی علاحدگی اختیار کرلی اور الگ تھلگ عبادت گاہیں بنالیں۔(۱۸)

حکومتی ذمے داریوں کے لیے خصوصی اہلیت

یہ تو قرآنِ مجید کی روشنی میں حکومتی مناصب کے لیے اہلیت کے بنیادی امور ہیں جس کی نسبت معنوی توسع کے طور پر پوری قوم کی طرف بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ جن افراد کو حکومت عطا کرنے کا تذکرہ قرآنِ مجید میں آیا ان کی اہلیت بھی ان کے ناموں کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب شاہِ مصر نے منتخب کیا تو ان سے کہا: ﴿ قَالَ إِنَّكَ ٱلۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴾(۱۹) یعنی آج سے آپ ہمارے ہاں بااختیار اور معتبر ہوں گے، موسیٰ علیہ السلام مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس گئے تو ان کی صاحب زادیوں نے انھیں اپنے ہاں خدمت کے لیے مقرر کرلینے کی بات کی اور اس کے لیے ان کی یہ دو صفات بیان کیں: ﴿ إِنَّ خَيۡرَ مَنِ ٱسۡتَـٔجَرۡتَ ٱلۡقَوِيُّ ٱلۡأَمِينُ ﴾(۲۰) (بے شک ایک بہتر ملازم جو آپ رکھیں، وہی ہوسکتا ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو)۔ اسی طرح سیدنا داوٗد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر آیا تو ان کے علم، صلاحیتوں اور قوتِ فیصلہ کی مثالیں پیش کی گئیں، چناں چہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا دَاوُۥدَ وَسُلَيۡمَـٰنَ عِلۡمًاۖ وَقَالَا ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنۡ عِبَادِهِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ * وَوَرِثَ سُلَيۡمَـٰنُ دَاوُۥدَۖ وَقَالَ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ عُلِّمۡنَا مَنطِقَ ٱلطَّيۡرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَىۡءٍۖ إِنَّ هَـٰذَا لَهُوَ ٱلۡفَضۡلُ ٱلۡمُبِينُ ﴾(۲۱) (اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کیا کہ اس کے پاس دولت کی وسعت نہیں ہے، اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا: ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصۡطَفَىٰهُ عَلَيۡكُمۡ وَزَادَهُۥ بَسۡطَةً فِى ٱلۡعِلۡمِ وَٱلۡجِسۡمِ ﴾(۲۲) (اسے اللہ تعالیٰ نے منتخب کر کے تمھارا بادشاہ بنایا ہے اور اسے علم کے ساتھ جسمانی طاقت دی ہے)۔ ان آیات طیبات سے تین اہم

۱۸- قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ۱۷، ص ۲۶۳؛ تفسیر الحدید: ۲۷

۱۹- یوسف: ۵۴

۲۰- القصص: ۲۶

۲۱- النمل: ۱۵-۱۶

۲۲- البقرۃ: ۲۴۷

صفات کا پتا چلتا ہے جو منصبِ حکومت کے امیدوار میں موجود ہونا ضروری ہیں: علم، قوت اور امانت داری۔ فقہا نے خلیفہ کے لیے جو شرائط بتلائی ہیں وہ در اصل قرآن وسنت کی انھی ہدایات کا نچوڑ ہیں۔ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- عدالت اپنی جامع تعریف کے ساتھ(۲۳)

۲- ایسا علم جو اسے جدید اور اچانک پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد کرنے اور ان کا حل نکالنے کے قابل بنادے۔(۲۴)

۳- طبی لحاظ سے صحت مند ہو یعنی اس کے حواس کان، آنکھ اور زبان وغیرہ درست کام کرتے ہوں تاکہ اس کا ادراک کا عمل متاثر نہ ہو۔

۴- اس کے اعضا ایسے نقص سے سلامت ہوں جس سے آزادانہ نقل و حرکت اور امورِ مملکت کی انجام دہی میں رکاوٹ ہو سکتی ہو۔

۵- صاحب رائے ہو اور اس میں امور رعیت چلانے اور لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

۶- جرأت مند اور بہادر ہو اور سرزمین کے تحفظ اور دفاع کے لیے اقدام کر سکتا ہو۔(۲۵)

آئینِ پاکستان میں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے امیدواروں کے کوائف شق نمبر ۶۲ اور ۶۳ میں بتائے گئے ہیں۔ یہ کوائف بھی مندرجہ بالا کوائف سے ملتے جلتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ شریعت کے احکام میں عاقل بالغ کی شرط لگائی جاتی ہے، آئین میں درج شرائط میں عمر کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جو کہ قومی اسمبلی کی رکنیت

۲۳- عدالت سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھے چال چلن کا مالک ہو، برائی اور بدکاری کے کاموں سے بچنے والا ہو، ظالم اور دھوکے باز نہ ہو، سازشی اور حیلہ ساز نہ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا امام بنایا تو انہوں نے دعا کی کہ اس کی اولاد کو بھی یہ منصب نصیب ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (البقرة: ۱۲۴)، عبدالرزاق احمد سنہوری، فقه الخلافة وتطورها، ت: توفیق محمد شاوی، نادیہ عبدالرزاق سنہوری، بیروت، مؤسسة الرسالة، ص۹۱

۲۴- یعنی مسلم معاشرے کا حکم ران ایسا تو ہو کہ قرآن وسنت کے دلائل سے فقہی اور قانونی مسائل کا حل تلاش کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ (سنہوری، نفس مرجع، ص ۹۲)

۲۵- ابوالحسن ماوردی، الأحكام السلطانية، ج۱، ص ۲۰

کے لیے پچیس سال اور سینٹ کی رکنیت کے لیے تیس سال ہے۔ یہ شاید اس لیے کہ کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے عام معاملات کے مقابلے میں زیادہ پختگی کی ضرورت ہوتی ہے، عمر کی اس قید سے یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ فقہ کی اکثر کتابوں میں حاکم کا قریش میں سے ہونا مذکور ہے اور کتبِ حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے جیسا کہ **صحیح بخاری** میں ہے: "لا يزال هذا الأمر في قريش ما بقي منهم إثنان."[۲۶] جب کہ دورِ جدید کی علاقائی ریاستوں اور جغرافیائی حدود کی پابندی کے ساتھ چوں کہ یہ شرط پوری ہونا ممکن نہ رہا اس لیے اس ملک کا شہری ہونا اور اس کے ووٹ کا اندراج ہونا وغیرہ ان شرائط میں شامل کر دیا گیا ہے۔ پھر شق نمبر ۶۲ کی ذیلی شقوں، اور ان کی ذیلی شقوں (د)، (ھ)، (و) اور (ز) میں دینی اور اخلاقی لحاظ سے اس کی نااہلیت کا تذکرہ کیا گیا ہے، جسے یہاں درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(د) وہ اچھے کردار کا حامل نہ ہو اور عام طور پر احکام اسلام سے انحراف میں مشہور ہو۔

(ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو۔

(و) وہ سمجھ دار، پارسا نہ ہو اور فاسق ہو، ایماندار اور امین نہ ہو۔

(ز) کسی اخلاقی پستی میں ملوث ہونے یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ ہو۔

اس کے بعد ذیلی شق (ح) بھی اسی کا حصہ ہے جس سے پاکستان کے اِسلامی تشخص کا تحفظ بھی نمایاں ہے، اس شق کی عبارت یوں ہے: "اس نے قیام پاکستان کے بعد ملک کی سالمیت کے خلاف کام کیا ہو یا نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہو۔"

البتہ غیر مسلموں کو دینی پابندی کی شرائط سے استثنا دیا گیا ہے۔

آئینِ پاکستان ۱۹۷۳ء کی شق ۶۳ میں مجلس شوری (پارلیمنٹ) کی رکنیت کے لیے نااہلیت کی صورتیں ذکر کی گئی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(الف) وہ فاتر العقل ہو اور کسی مجاز عدالت کی طرف سے ایسا کیا گیا ہو، یا

(ب) وہ غیر برأت یافتہ دیوالیہ ہو، یا

(ج) وہ پاکستان کا شہری نہ رہے اور کسی بیرونی ریاست کی شہریت حاصل کرے، یا

۲۶- **صحيح البخاري**، كتاب المناقب، باب مناقب قريش، حديث: ۳۵۰۱

(د) وہ پاکستان کی ملازمت میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہو، ماسوائے ایسے عہدے کے جسے قانون کے ذریعے ایسا عہدہ قرار دیا گیا ہو جس پر فائز شخص نااہل نہیں ہوتا۔

(ز) وہ کسی ایسی رائے کی تشہیر کر رہا ہو یا کسی ایسے طریقے پر عمل کر رہا ہو جو نظریۂ پاکستان یا پاکستان کے اقتدار اعلی، سالمیت یا سلامتی یا اخلاقیات، یا امنِ عامہ کے قیام یا پاکستان کی عدلیہ کی دیانت داری یا آزادی کے لیے مضر ہو، یا جو پاکستان کی مسلح افواج یا عدلیہ کو بدنام کرے یا اس کی تضحیک کا باعث ہو، یا

(ح) وہ کسی مجاز سماعت عدالت کی طرف سے فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت بدعنوانی، اخلاقی پستی یا اختیار یا اتھارٹی کے بے جا استعمال کے جرم میں سزایاب ہو چکا ہو، یا

(ط) وہ پاکستان کی ملازمت یا وفاقی حکومت، صوبائی حکومت یا کسی مقامی حکومت کی طرف سے قائم کردہ یا اس کے زیرِ اختیار کسی کارپوریشن یا دفتر کی ملازمت سے غلط روی یا اخلاقی پستی کی بنا پر ہٹا دیا گیا ہو یا جبری طور پر فارغ خدمت کر دیا گیا ہو۔

(ک) وہ پاکستان کی یا کسی آئینی ہیئت یا کسی ایسی ہیئت کی جو حکومت کی ملکیت یا اس کے زیر نگرانی ہو یا جس میں حکومت تعدیلی حصہ یا مفاد رکھتی ہو، ملازمت میں رہ چکا ہو، تاوقتیکہ اس کی مذکورہ ملازمت ختم ہوئے دو سال کی مدت نہ گزر گئی ہو، یا

(ل) اسے فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون کے تحت کسی بدعنوانی یا غیر قانونی حرکت کا مجرم قرار دیا جائے تاوقتیکہ اس کی مذکورہ ملازمت ختم ہوئے دو سال کی مدت نہ گزر گئی ہو یا

(ل) اسے فی الوقت نافذ العمل کسی دیگر قانون کے تحت کسی بدعنوانی یا غیر قانونی حرکت کا مجرم قرار دیا جائے، تاوقتیکہ اس تاریخ کو جس پر مذکورہ حکم مؤثر ہوا پانچ سال کا عرصہ نہ گزر گیا ہو۔

اس کے بعد کئی دفعات میں اس کے کسی طرح کی مالی بدعنوانی میں ملوث ہونے کا ذکر ہے۔[۲۷]

۲۷- فرمان قانونی ڈھانچہ ۲۰۰۲ء (فرمان چیف ایگزیکٹو نمبر ۲۴ مجریہ ۲۰۰۲ء) کے آرٹیکل ۳ اور جدول کی رو سے تبدیل اور اضافہ کیے گئے۔

انتخاب سے پہلے امیدواروں کی عملی تربیت

ایک مسلم معاشرے کے حکومتی عمل میں شریک ہونے کے خواہش مند شخص کے لیے ضروری ہے کہ انتخاب لڑنے یا اپنے آپ کو حکومتی خدمت کے لیے پیش کرنے سے پہلے عملِ صالح اور خدمتِ خلق میں اچھا مقام پیدا کرلے۔ اس کی بہت اچھی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا بہ طورِ سربراہِ حکومت انتخاب ایک کافر بادشاہ نے کیا تھا جو ان کے علم، کردار، پختگی اور معاملہ فہمی سے متأثر ہوا تھا اور اس نے خود حکومت کے تمام تر اختیارات ایک ایک کرکے ان کے ہاتھ میں دے دیے۔ مصر کے جس ماحول میں انہوں نے اصلاحی کام کیا اس ماحول کی سختی کا اندازہ سورۂ یوسف پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ کس قدر دین دشمن، بے حیا اور ظالمانہ ماحول تھا مگر ان کی محنت، لگن، دانائی اور تائید خداوندی سے کس طرح وہ ماحول بدلا۔ اسی سورت میں حضرت یوسف عَلَیہِ السَّلام کو پانچ بار "من المحسنين" (اچھے کام کرنے والا) کہا گیا ہے۔ پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو دانائی اور علم بخشا اور اچھے کام کرنے والوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں"[۲۸] دوسری بار فرمایا: "اور ان کے ساتھ دو اور جوان بھی داخل زنداں ہوئے۔ ایک نے ان میں سے کہا کہ میں کیا دیکھتا کیا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور جانور ان میں سے کھا رہے ہیں، ہمیں ان کی تعبیر بتا دیجیے کہ آپ ہمیں بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں"[۲۹] تیسری آیت میں بادشاہ کے حکم کا تذکرہ ہے کہ اسے لے آؤ میں اسے اپنے لیے خاص لوگوں میں شامل کرلوں گا، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اسی طرح ہم نے یوسف عَلَیہِ السَّلام کو ملک میں مقام عطا فرمایا کہ جہاں چاہتے رہ سکتے، یہیں فرمایا: ہم اسی طرح اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔[۳۰] چوتھی آیت میں وہ منظر ہے جب یوسف عَلَیہِ السَّلام کے بھائی مصر سے کنعان جاتے ہوئے راستے میں روک لیے جاتے ہیں اور وہی بھائی جنھوں نے انھیں کنویں میں پھینکا تھا، اسے کوئی اور سمجھ کر ان کی منت سماجت کر رہے ہیں کہ اس لڑکے کو ہمارے ساتھ جانے دیں،

۲۸- یوسف: ۲۲

۲۹- یوسف: ۳٦

۳۰- یوسف: ۵٦

اس کا بوڑھا والد ہے، آپ ہمیں بڑے محسن نظر آتے ہیں۔[۳۱] پانچویں آیت میں بھائیوں کی کہانی انجام کو پہنچ رہی ہے، انہیں یوسف علیہ السلام کی پہچان ہو چکی ہے، وہ ان کے بھرپور اقتدار میں ان کے دربار میں ہیں اور اب یوسف علیہ السلام خود کہتے ہیں: میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر احسان کر دیا ہے، جو بھی تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھلے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔[۳۲] آخر یوسف علیہ السلام نے کون سی بھلائی کی تھی، اس کی کچھ مثالیں یہ ہو سکتی ہیں: کوئیں سے نکلے ہوئے یوسف کو بھائیوں نے غلام کہہ کر بیچ دیا اور یوسف کو اشارہ کیا کہ انکار مت کرنا تو انھوں نے یہ سوچ کر کہ میرے بھائیوں اور اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کے خاندان کی بری شہرت نہ ہو، غلام ہونے کا اقرار کر لیا، اگرچہ ان کا اشارہ اپنے رب کا غلام ہونے کی طرف ہو۔ عزیز مصر کے محل میں الزام لگا کر بے گناہ قید کر دیا گیا مگر عزیز کی عزت کا پاس کیا اور بات نہیں بڑھائی بلکہ جیل جا کر اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ قید خانے میں قیدیوں کی ایسی خدمت کی اور یوں رب سے ان کا رشتہ جوڑا کہ سب نے آپ کو "محسن" قرار دیا۔۔ بالآخر بادشاہِ مصر نے اپنے کار خاص پر مقرر کرنے کے لیے انہیں قید خانے سے خود بلایا، ان کے ساتھ ملک میں آنے والے قحط اور معاشی بد حالی پر گفتگو کی اور اس کے بعد ان کا "مکین امین" منصب دار اور رازدار کے طور پر تقرر کر دیا،[۳۳] چوں کہ ملک کو آئندہ چل کر معاشی مسائل کا سامنا تھا، سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے تقرر کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ وسائل آمدن کی نگرانی اپنے ذمے لینے کی تجویز دی اور اپنی اہلیت کے لیے بتایا کہ میں "حَفِيظٌ عَلِيمٌ" یعنی اس کی حفاظت کی صلاحیت رکھتا ہوں اور اس کے طریقوں سے واقف ہوں۔[۳۴]

اس تقرر اور اس ذمہ داری تک ہی ان کے اختیارات محدود نہ رہے، بلکہ رفتہ رفتہ ملک کے تمام شعبوں میں انھی کی رائے اور انھی کا اختیار چلنے لگا کیوں کہ وہ محسنین میں سے تھے۔[۳۵] اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکومت دینی معیار پر پوری نہ بھی اترتی ہو تو انسان خدمت اور اصلاح کی نیت سے اس میں خدمات سرانجام

۳۱- یوسف : ۷۸

۳۲- یوسف: ۹۰

۳۳- یوسف : ۵۴

۳۴- یوسف : ۵۵

۳۵- یوسف : ۵۶

دینے کو قبول کر سکتا ہے جب تک اسے خود خلاف شرع کام کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ سیاسی عہدوں کے امیدواروں کی تعلیم وتربیت دین، سیاست اور خدمت میں کرنی چاہیے۔

طریقۂ انتخاب

نبی کریم ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد آپ کے جلیل القدر صحابہؓ آپ کے خلفا کے طور پر حکومتی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ ان خلفا کا انتخاب مختلف طریقوں سے ہوا، ہر ایک کے اوصاف اور اہلیت خود زبان نبوت سے بیان ہو چکے تھے اور معاشرے کے افراد کے دل ودماغ میں نقش تھے، مگر یہ کہ انتخاب کس کا ہو اور کیسے ہو، اس کے بارے میں کوئی واضح اور قطعی فیصلہ نبی کریم ﷺ نے نہیں فرمایا۔ اس کا نقشہ سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں کھینچا:

عن الأسود بن قيس، عن رجل، عن علي، أنه قال يوم الجمل: "إن رسول الله ﷺ لم يعهد إلينا عهدا نأخذ به في إمارة، ولكنه شيء رأيناه من قبل أنفسنا، ثم استخلف أبو بكر رحمة الله، على أبي بكر، فأقام واستقام، ثم استخلف عمر رحمة الله، على عمر، فأقام واستقام، حتى ضرب الدين بجرانه. (۳۶)

اسود بن قیس سے روایت ہے، انھوں نے ایک اور شخص سے اور انھوں نے حضرت علیؓ سے نقل کیا، کہ انھوں نے جنگ جمل کے دِن فرمایا: "نبی کریم ﷺ نے امارت کے بارے میں ہمیں کوئی واضح حکم نہیں فرمایا، بلکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس پر ہم نے خود غور کر کے فیصلہ کیا، جس کے نتیجے میں ابو بکرؓ خلیفہ بنا دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ ابو بکر کو اپنی رحمت سے نوازے، وہ خود بھی سیدھے راستے پر قائم رہے اور لوگوں کو بھی سیدھی راہ پر قائم رکھا، پھر عمر خلیفہ بنا دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ عمر کو اپنی رحمت سے نوازے، وہ خود بھی سیدھے راستے پر قائم رہے اور لوگوں کو بھی سیدھی راہ پر قائم رکھا یہاں تک کہ دین خوب مضبوط ہو گیا۔

یہی بات اس سے قبل حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی، جسے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یوں بیان فرماتے ہیں:

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زخم آیا تو میں سب سے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے مجھ سے فرمایا: تین چیزیں مجھ سے سن کر خوب یاد کر لو، مجھے ڈر ہے کہ لوگوں سے میری ملاقات نہیں ہو سکے گی: پہلی بات یہ ہے کہ میں نے کلالہ

۳۶- احمد بن حنبل، مسند الإم أحمد بن الحنبل، تحقیق: شعیب الأرنؤوط۔ عادل مرشد، وآخرون، مسند علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ، حدیث: ۹۲۱

کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، دوسری یہ کہ میں نے لوگوں پر کسی شخص کو خلیفہ مقرر نہیں کیا اور تیسری بات یہ کہ میرے تمام غلام آزاد ہیں۔ یہ سن کر لوگوں نے عرض کیا کہ کوئی خلیفہ تو مقرر کر ہی دیں، آپؓ نے فرمایا: "أيّ ذلك أفعل فقد فعله من هو خير مني، إن أدع إلى الناس أمرهم، فقد تركه نبي الله عليه الصلاة والسلام، وإن أستخلف فقد استخلف من هو خير مني."(۳۷) (میں ان میں سے جو فیصلہ بھی کروں، مجھ سے پہلے مجھ سے بہتر شخص وہ فیصلہ کر چکا ہے: اگر میں لوگوں کا معاملہ خود ان کے اپنے اوپر چھوڑ جاؤں تو مجھ سے پہلے نبی کریم ﷺ ایسا کر چکے ہیں۔ اور اگر میں کسی کو اپنا جانشین بنا جاؤں تو مجھ سے بہتر شخص (حضرت ابو بکرؓ) جانشین مقرر کر چکے ہیں۔)

پھر حضرت عمرؓ نے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر ایک تیسرا طریقہ اختیار فرمایا اور وہ چھ آدمیوں کی شوریٰ کا طریقہ تھا، گویا یہ ایک مجلس انتخاب تھی جو خلیفہؓ نے اپنے سامنے مقرر کر دی۔ اس عمل سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ اِسلام میں انتخاب کا کوئی ایک طریقہ مقرر نہیں، جس طریقے سے بھی انتخاب ہو اگر عادلانہ طریقے سے انتخاب کی تسلی ہو تو کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ یہ قرآنِ مجید کے تربیتی انداز کا ایک نمونہ ہے کہ اس کی ہدایات اور احکام مختلف اسالیب کو محیط ہیں جن میں سے ایک اسلوب معاشرتی امور میں بنیادی اصول بتا کر حتمی فیصلہ معاشرے کے افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شوریٰ کا اصول اور عرف کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرنے کا اصول اس سلسلے میں رہنما ہیں، جس کی مثالیں قرآن وسنت میں بہ کثرت ملتی ہیں۔ اسی اصول کو ہم قرآن وسنت کی روشنی میں انتخابِ امیر کارہ نما اصول قرار دے سکتے ہیں۔ مگر ان تمام معاملات میں قرآنی حکم ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ﴾(۳۸) (ان کے معاملات آپس میں مشورے سے طے پاتے ہیں) کا عنصر موجود رہا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جب انتخاب ہوا تو سقیفۂ بنی ساعدہ میں ایک طویل مشاورت ہوئی، جس میں گرما گرم بحث بھی ہوئی، کیوں کہ معاملہ بالکل نیا تھا۔ طویل بحث اور دلائل کے تبادلے کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفہ بنانے پر اتفاق ہوا۔(۳۹)

۳۷- نفس مصدر، مسند عمر بن الخطاب، حدیث: ۲۹۹

۳۸- شوریٰ: ۳۸

۳۹- عبد الرزاق بن ہمام صنعانی، مصنف عبد الرزاق، تحقیق: حبیب الرحمن الاعظمی، کتاب المغازی، بَيْعَةُ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي سَقِيفَةِ بَنِي سَاعِدَةَ، حدیث: ۹۷۵۸

حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی طرف سے حضرت عمر ؓ کو جانشین بنایا گیا تو انہوں نے یہ کام محض اپنی صواب دید سے نہیں کر دیا، بلکہ اس کے لیے بھی کبارِ صحابہؓ سے مشورہ کیا، ان سے اس بات پر دلائل کا تبادلہ ہوا اور اس کے بعد انھوں نے اپنا فیصلہ لکھوایا۔ واقدی ؒ کی درجِ ذیل عبارت سے اس کا نقشہ سامنے آجاتا ہے:

واقدی ؒ نے کئی طرق سے یہ بات نقل کی ہے کہ جب حضرت ابو بکر ؒ کی صحت زیادہ خراب ہوگئی تو انہوں نے حضرت عبد الرحمن بن عوف کو بلایا اور پوچھا: مجھے عمر ؓ کے بارے میں بتایئے، انھوں نے فرمایا: آپ مجھ سے جو بات پوچھ رہے ہیں آپ کو اس کے بارے میں زیادہ علم ہے، حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا: بے شک ایسا ہو، پھر بھی۔ اس پر حضرت عبد الرحمن ؓ نے فرمایا: ان کے باے میں آپ ؓ کی جو رائے ہے، اللہ کی قسم وہ اس سے بھی بہتر ہیں۔ پھر حضرت ابو بکر ؓ نے حضرت عثمان ؓ کو بلایا اور فرمایا: مجھے عمر ؓ کے بارے میں بتایئے، انھوں نے فرمایا: آپ ؓ ان کے بارے میں ہم سب سے زیادہ خبر رکھتے ہیں، انھوں نے کہا: اس کے باوجود بھی آپ بتائیں۔ حضرت عثمان ؓ نے فرمایا: اللہ گواہ ہے کہ میرے علم کے مطابق ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے، اس پر مزید یہ کہ ہمارے درمیان ان جیسا کوئی نہیں۔ ان دونوں کے ساتھ ساتھ حضرت ابو بکر ؓ نے سعید بن زید ؓ، اسید بن حضیر اور دیگر مہاجرین وانصار سے بھی مشورہ کیا۔ حضرت اُسید ؓ کی ان کے بارے میں رائے یہ تھی: ”اللہ گواہ ہے کہ میرے علم کی حد تک آپ کے بعد وہی بہتر ہیں، جس بات سے خوش ہونا چاہیے اس سے خوش ہوتے ہیں اور جس سے ناراض ہونا چاہیے اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان کے دِل میں ہوتا ہے وہ ان کے ظاہر سے بہتر ہوتا ہے۔ اس معاملے کے لیے ان سے مضبوط تر آدمی میسر نہیں آسکتا۔“ کچھ صحابہؓ حضرت ابو بکر ؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں سے کسی نے کہا: ”اگر آپ کے رب نے آپ ؓ سے عمر کو جانشین بنانے کے بارے میں پوچھ لیا تو آپؓ کیا جواب دیں گے باوجود ے کہ آپ ؓ کو ان کی سخت مزاجی معلوم ہے؟ حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا: ”کیا آپ ؓ مجھے اللہ تعالیٰ کا خوف یاد دلا رہے ہیں، میرا اللہ گواہ ہے! میں نے لوگوں پر ان میں سے سب سے بہترین کو جانشین بنایا ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے آپ ؓ اپنے باقی تمام ساتھیوں کو یہ بات پہنچادیں۔“ پھر آپ ؓ نے حضرت عثمان ؓ کو بلایا اور فرمایا لکھیے: بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ ابو بکر بن ابی قحافہ ؓ کا عہد ہے جو اس نے دنیا میں اپنے آخری وقت میں کیا ہے، جب کہ وہ اس سے نکلنے والا ہے، اور یہ اس کی آخرت کا ابتدائی وقت ہے جس کی طرف وہ داخل ہونے والا ہے، یہ ایسا وقت ہے جب کافر ایمان لے آتا ہے، بد عمل یقین کرلیتا ہے اور جھوٹا سچ بولنے لگتا ہے۔ میرا عہد یہ ہے کہ میں نے اپنے بعد تم لوگوں کے لیے عمر بن خطاب کو جانشین بنایا ہے، لہٰذا تم لوگ اس کی بات مانو اور اس کی اطاعت کرو۔ میں نے یہ

کام کر کے اللہ تعالیٰ سے، اس کے رسول ﷺ سے، اس کے دین سے، اپنے آپ سے اور تم سب لوگوں سے کوئی بھلائی چھپا کر نہیں رکھی، اگر وہ عدل کریں تو مجھے ان سے یہی توقع ہے اور میں انہیں ایسا ہی جانتا ہوں اور اگر باوجود ے کہ معاملے کو بدل ڈالا تو ہر شخص جو کچھ کمائے گا وہی پائے گا۔ میں نے تو بھلائی کا ہی ارادہ کیا، اور میں غیب نہیں جانتا، جنھوں نے ظلم کیا انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پہلو پھرتے ہیں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس کے بعد تحریر پر مہر لگا دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نامہ باہر لے جانے کا حکم دیا جس پر لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور وصیت کی۔

ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ زیادہ بیمار ہو گئے تو اپنے گھر کے روشن دان سے سر نکال کر لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: ”لوگو! میں نے ایک عہد تمھارے لیے کر دیا ہے، کیا تم لوگ اس پر راضی ہو گے لوگوں نے کہا: اے رسول اللہ کے خلیفہ رضی اللہ عنہ ہم اس پر راضی ہیں۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ہم صرف اسی صورت راضی ہوسکتے ہیں جب یہ عہد حضرت عمرؓ کے بارے میں ہو تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ عمر رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔[۴۰]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں بھی شوریٰ کا کردار واضح نظر آتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے:
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دے دی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیا جائے۔ اس کمیٹی کا ایک پس منظر ہے جسے امام بخاری نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا آخری حج ادا کیا، وہاں حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو یہ کہتے سنا کہ ”اگر عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو میں فلاں شخص کی بیعت کروں گا“، یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے فوراً عام مسلمانوں سے خطاب کر کے اس کے بارے میں واضح ہدایات جاری کرنے کا فیصلہ کیا، مگر حضرت عبد الرحمن کے کہنے پر کہ اس مجمع میں ہر سطح کے لوگ ہوں گے، کوئی آپ کی بات سمجھ سکے گا کوئی نہیں سمجھ سکے گا، پھر جس کسی کو جیسی کیسی سمجھ آئی ہو

۴۰- ابن سعد، **الطبقات الکبریٰ**، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ط۱، ۱۴۱۰ھ - ۱۹۹۰ء، ج۳، ص۱۴۸؛ ابن شبہ، **تاریخ المدینۃ**، ت: فہیم محمد شلتوت، جدہ، ۱۳۹۹ھ۔ ج۲، ص۶۶۷؛ ابن حجر الھیثمي، **الصواعق المحرقة على أهل الرفض والضلال والزندقة**، ت: عبد الرحمن بن عبد اللہ الترکی - کامل محمد الخراط، لبنان، مؤسسۃ الرسالۃ، ط۱، ۱۴۱۷ھ - ۱۹۹۷ء، ج۱، ص۲۵۴

گی وہ اس کے مطابق آپ کی بات کو کیا سے کیا مطلب دے دیں گے۔ آپ مہربانی فرمائیں اور مدینہ منورہ جا کر یہ بات کریں تو بہتر ہو گا کیوں کہ وہ دار الہجرت ہے، وہی سنت رسول ﷺ کا مرکز اور فقہا کا شہر ہے۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بات مان لی اور مدینہ منورہ پہنچ کر جلد ہی ایک طویل خطاب فرمایا، جس میں اسی بات کا حوالہ دے کر نئے خلیفہ کے انتخاب کا یہ اصول بتایا: "مجھے خبر ملی ہے کہ تم میں سے کوئی کہتا ہے کہ اگر عمر مر جائیں تو میں اللہ کی قسم فلاں کی بیعت کر لوں، تمہیں کوئی شخص یہ کہہ کر دھوکہ نہ دے کہ ابو بکر کی بیعت اتفاقیہ تھی اور پھر پوری ہو گئی، سن لو کہ وہ ایسی ہی تھی، لیکن اللہ نے اس کے شر سے محفوظ رکھا اور تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے جس میں ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسی فضیلت ہو، جس شخص نے کسی کے ہاتھ پر مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر بیعت کر لی تو اس کی بیعت نہ کی جائے۔"[۴۱] جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خنجر کا زخم لگ گیا اور ان کے بچنے کی امید نہ رہی تو صحابہؓ نے ان سے اپنا جانشین مقرر کرنے کی درخواست کی، آپؓ نے غالباً موقع حج پر مکہ مکرمہ میں پیش آنے والے واقعے کو سامنے رکھتے ہوئے چھ جلیل القدر صحابہ کی کمیٹی بنائی جس میں حضرت علیؓ، حضرت عثمان، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اسمائے گرامی شامل تھے۔ ان حضرات کی اہلیت کا معیار انھوں نے یوں بتایا: "میری نظر میں امر خلافت کے لیے اہل ان حضرات کے علاوہ کوئی نہیں، کیوں کہ نبی کریم ﷺ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو وہ ان سے راضی تھے۔"[۴۲]

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جن حضرات کو خلافت کا اختیار دیا تھا ان میں سے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خود خلافت کا امیدوار بننے سے معذرت کر لی، البتہ انہوں نے یہ پیشکش کی کہ اگر وہ حضرات چاہیں تو میں ان میں سے خلیفہ کے انتخاب میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔ ان سب حضرات اس پر اتفاق کر کے حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو اس کا ذمہ دار مقرر کر دیا، انھیں آج کے دور میں چیف الیکشن کمشنر کہنا چاہیں تو شاید درست ہو۔ بخاری شریف میں آیا ہے:

کہ اس بات کا سننا تھا کہ لوگ عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کے پیچھے ہو لیے یہاں تک کہ ان بقیہ حضرات میں سے کسی کے پاس ایک آدمی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ پھر وہ حضرات ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہوتے رہے یہاں تک صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام باقی رہ گئے۔ حضرت عبد الرحمن کے پاس لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور وہ

۴۱- **صحيح البخاري**، كتاب الحدود، بَابُ رَجْمِ الحُبْلَى مِنَ الزِّنَا إِذَا أَحْصَنَتْ، حديث: ۶۸۳۰

۴۲- **صحيح البخاري**، كتاب المناقب، بَابُ قِصَّةِ البَيْعَةِ، وَالاِتِّفَاقِ عَلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَفِيهِ مَقْتَلُ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، حديث: ۳۷۰۰

انہیں آئندہ خلیفہ کے بارے میں اپنی اپنی رائے بتاتے جاتے تھے۔ حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ اس قدر توجہ سے ہر ایک کی رائے سنتے تھے کہ اسی عمل میں کئی روز گزر گئے۔ حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اس ذمہ داری کی وجہ سے ان راتوں میں میری تو آنکھ تک نہیں لگی یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر رائے قرار پائی اور اس کے بعد ان کے لیے بیعت لی گئی۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسجد نبوی میں منبر کے پیچھے حضرات جمع ہو گئے، پھر مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ موجود تھے ان کو بلا بھیجا، اور سردار لشکر کو بلا بھیجا، یہ سب لوگ حج میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لوگوں کے اتفاق کا ذکر کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے کلمات کہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (حضرت عثمان سے کہا) میں اللہ اور اس کے رسول اور آپ دونوں خلیفہ کی سنت پر تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی اور تمام لوگوں نے مہاجرین و انصار، سرداران لشکر اور مسلمانوں نے بیعت کی۔ [۴۳]

اس عمل کے پہلے حصے کو اگر ہم رائے عامہ کے مطابق الیکشن کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں اور دوسرا عمل بیعت وفا و اطاعت تھا جو کہ اسلامی معاشروں کی خصوصیت رہی ہے اور اطاعت الوالامر کے قرآنی حکم کی تعمیل ہے، ظاہر ہے یہ بیعت اسی صورت میں جچتی ہے جب حاکم کا انتخاب بھی قابلیت کی بنیاد پر ہوا ہو۔ اس الیکشن میں بھی ایک بات پیشِ نظر رہے کہ مسلم معاشرے کے حاکم کا انتخاب تھا، اس لیے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی نے حج کے موقع پر اس کے اعلان کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا کہ مدینہ منورہ جا کر آپ اس موضوع پر گفتگو کریں، کیوں کہ حج پر ہر سطح کی سمجھ بوجھ والے لوگ ہوتے ہیں جب کہ مدینہ منورہ فقہا اور سنت نبوی کے چلن والا شہر ہے، یہاں بھی بہ ظاہر مسلم معاشرے کے حکمران کے لیے ووٹر کی ایک تربیتی یا علمی سطح معلوم ہوتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب دورِ جدید کے انتخابی عمل سے قریب تر ہے کیوں کہ ان کی بیعت مسجد میں ہوئی۔ **تاریخ طبری** رحمۃ اللہ علیہ میں ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہو گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سخت رنجیدہ تھے اور اپنے دونوں صاحب زادوں حضرات حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ، اور حضرات طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادوں پر سخت ناراضی کا اظہار کرنے کے بعد اپنے گھر پہنچے تھے، کیوں کہ ان تمام صاحب زادوں کو انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر مامور کیا تھا، مگر بلوائی دیوار پھلانگ کر اندر چلے گئے تھے۔ ایسے میں لوگ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ امت کا امام کے بغیر رہنا مناسب نہیں، اس لیے ہم

۴۳- **صحيح البخاري**،كتاب الأحكام، باب كيف يبايع الإمام الناس، حديث: ۷۲۰۷

آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لَيْسَ ذَلِكَ إِلَيْكُم إِنَّمَا ذَلِك إِلَى أهل بدر فَمن رَضِي بِهِ أهل بدر فَهُوَ خَلِيفَة." (یہ کام تم لوگوں کے کہنے پر ہونے والا نہیں، اس کا فیصلہ اہلِ بدر کریں گے، جسے اہلِ بدر نے خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا وہی خلیفہ ہوگا) چناں چہ تمام اہلِ بدر نے آکر حضرت علیؓ کی بیعت کی۔(۴۴)

ابن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت حضرت عثمان کی شہادت کے دوسرے روز مدینہ منورہ میں ہوئی اور وہاں جتنے صحابہ موجود تھے سب نے ان کی بیعت کی۔(۴۵) طبری رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت ہوئی تو میں اپنے والد محترم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ تھا۔ اس موقع پر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں حاضر ہوئے اور کہا: حضرت عثمان تو شہید ہو گئے، لوگوں کے لیے امام کا ہونا تو ضروری ہے، ہماری نظر میں آج آپ سے زیادہ اس منصب کا کوئی حق دار نہیں، نہ آپ سے پہلے کا مسلمان ہونے والا کوئی ہے اور نہ آپ سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت رکھنے والا کوئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "آپ لوگ ایسا نہ کریں، میرا وزیر بن کر رہنا، امیر بننے سے بہتر ہے۔" ان حضرات نے کہا: ہم ایسا کرنے والے نہیں یہاں تک کہ آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر یہ کام مسجد میں ہوگا، میری بیعت خفیہ نہیں ہوگی اور مسلمانوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہوگی، چناں چہ جب وہ مسجد میں تشریف لے گئے تو مہاجرین وانصار بھی مسجد میں آئے اور انھوں نے آپؓ کی بیعت، اس کے بعد دوسرے لوگوں کی بیعت ہوئی۔(۴۶)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حالات بہت خراب ہو گئے تھے، بلوائی حضرت طلحہ، حضرت سعد اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے پیچھے پھرتے رہے کہ وہ خلیفہ بننا منظور کرلیں، جب کوئی تیار نہ ہوا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو درخواست کی انھوں نے سخت انکار کیا مگر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بار بار اصرار پر تیار ہوئے اور اس

۴۴- ابن حجر ہیثمی، الصواعق المحرقة، ج۱، ص ۳۴۶-۳۴۸

۴۵- یوسف بن اسماعیل بن یوسف نَّبھانی، الأساليب البديعة في فضل الصحابة وإقناع الشيعة، (مطبوع بهامش كتاب شواهد الحق)، مصر، المطبعة الميمنية، ج۱، ص ۱۴۹-۱۵۰

۴۶- محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الملی، ابوجعفر طبری، تاريخ الطبري- تاريخ الرسل والملوك، عریب بن سعد قرطبی، صلة تاريخ الطبري، بیروت، دار التراث، ط۲، ۱۳۸۷ھ، ج۴، ص ۴۲۷

کے لیے ایک ابتدائی بیعت ہوئی۔ پھر آپ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے اور عام لوگوں کو بیعت کی دعوت دی گئی۔ اسے بھی عام انتخاب کی ایک صورت کہا جا سکتا ہے۔

آج کے دور میں الیکشن کا جو طریقہ مروج ہے اسی کی مثال تاریخ اسلامی میں تلاش کرنے سے عمر بن ہبیرہ فزاری (متوفی ۱۱۰ھ - ۷۲۸ء) جب خلفاءِ بنی امیہ (یزید بن عبد الملک) کے دور میں عراق اور خراسان کا والی تھا۔ اس نے سن ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ ہجری میں مسلم بن سعید کو خراسان کا افسرِ اعلیٰ بنا کر بھیجا تو اسے نصیحت کی کہ اپنے افسر ایسے لوگوں کو بناؤ جن کی ذمہ داری تم پر نہ آئے اور اس کے لیے اس نے (عمال العذر) کا لفظ اختیار کیا۔ مسلم بن سعید نے پوچھا: وہ کیسے ؟ تو ابن ہبیرہ نے کہا: "ہر علاقے کے لوگوں سے کہو کہ وہ اپنا عامل خود منتخب کریں۔ جب وہ کسی شخص کو منتخب کر لیں تو تم اسی کو پروانۂ تقرر دے دو۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اگر ان کا نمائندہ اچھا ہوا تو اس کی اچھائی کا فائدہ تمہیں بھی ہو گا اور اگر بُرا ہوا تو اس کا خمیازہ انہیں کو بھگتنا پڑے گا اور تمہاری اس میں کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔"(۴۷)

نمائندوں کا انتخاب

قرآنِ مجید نے بنی اسرائیل کے لیے بارہ نقبا کے تقرر کا ذکر فرمایا ہے،(۴۸) ہر نقیب اپنے اپنے قبیلے کے امور کو سنبھالتا اور ان کے مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ مگر ان کا انتخاب نص یعنی وحی الٰہی کے ذریعے ہوا تھا اور ان سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ نماز قائم کریں، زکاۃ ادا کریں، انبیاء پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں، اس طرح یہ انتخاب عوامی نہیں بلکہ الٰہی تھا، البتہ نمائندے منتخب کرنے کا ثبوت اس سے مل جاتا ہے۔ عہدِ نبوی میں قبائلی نمائندوں کے انتخاب کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے عہدِ مبارک کی مثال بیعتِ عقبہ کے موقع پر نقبا (نمائندوں) کا انتخاب ہے۔ یثرب کے لوگ حج کو آئے ہوئے تھے تو اس موقع پر ستر آدمی وہ بھی تھے جو نبی کریم ﷺ کی دعوت پر پہلی ملاقات میں مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں اپنے کافر ساتھیوں سے چھپ کر نبی کریم ﷺ سے رات کے تیسرے پہر ملاقات کی۔ ان کو نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ اپنے درمیان سے بارہ نقیب (نمائندے) نکال لاؤ جو تمہارے معاملات کے ذمہ دار ہوا کریں گے، چناں چہ انھوں نے بارہ نقیب منتخب کر کے نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کیے۔ گویا یہ ایک خاص طبقے کے لیے عوامی انتخاب کہلا سکتا ہے۔

۴۷- طبری، نفسِ مصدر، ج ۷، ص ۳۵

۴۸- المائدۃ: ۱۲

ووٹ کی شرعی حیثیت

منصب حکومت بھی ایک امانت ہے اور اس پر کسی کو مقرر کرنا بھی امانت ہے خواہ وہ تقرر حاکم کی طرف سے ماتحت مناصب پر ہو یا آج کے دور کے تقاضوں کے مطابق عوام کے ووٹ کے ذریعے ہو۔ اسی اصول کے تحت ووٹ بھی امانت ہے۔ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۸ ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا۟ ٱلْأَمَـٰنَـٰتِ إِلَىٰٓ أَهْلِهَا ﴾ (بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو)۔ فقہاے امت نے اس آیتِ کریمہ کو مناصب کی تفویض اور تقسیم کے لیے بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ اس آیت کریمہ کا شانِ نزول ہے؛ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے حقیقی چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سمیت کئی لوگ بیت اللہ شریف کی چابی حاصل کرنے کے لیے آپ ﷺ سے درخواست کر رہے تھے کہ یہ ایک عظیم منصب تھا جو مدتوں سے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے تمام پیاروں کی خواہش کے باوجود یہ چابی حضرت عثمان ابن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور قیامت تک انھیں کے خاندان میں رہنے کی بشارت دی۔ اس آیت کی رو سے حکومت جب وزارتوں اور دیگر عہدوں اور مناصب کی تقسیم کرتی ہے تو اس کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ عہدے اہل لوگوں کو سپرد کرے اور جب جمہوری نظام میں صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبران منتخب کرنے کی ذمے داری امت کے افراد پر آن پڑتی ہے تو ان کی بھی یہی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے ووٹ کے ذریعے اہل لوگوں کو منتخب کریں، کیوں کہ اسمبلی کا ممبر ہونا ایک منصب ہے اور یہی ممبران حکومت کا انتخاب کرتے ہیں۔ مناصبِ حکومت کے لیے اہلیت پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اب جب یہ معلوم ہو گیا کہ ووٹ ایک امانت ہے تو قرآن مجید نے آیتِ دَین کے بعد امانت کی ادائگی کی اہمیت یوں بتلائی ہے: اور اگر تم سفر پر ہو اور لکھنے والا مل نہ رہا ہو تو کوئی چیز رہن باقبضہ رکھ لو، اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے (یعنی رہن کے بغیر قرض دیدے) تو امانت دار کو چاہیے کہ ﴿ فَلْيُؤَدِّ ٱلَّذِى ٱؤْتُمِنَ أَمَـٰنَتَهُۥ وَلْيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا۟ ٱلشَّهَـٰدَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُۥٓ ءَاثِمٌ قَلْبُهُۥ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴾[۴۹] (صاحب امانت کی امانت ادا کرے اور اللہ سے، جو اس کا پروردگار ہے، ڈرے اور دیکھنا شہادت کو مت چھپانا، جو اس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہ گار ہوگا اور خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے)۔ حدیث شریف میں کچھ مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کسی چیز کا انتخاب اپنے ذمے لگنے کو امانت بتایا اور

۴۹- البقرۃ: ۲۸۳

اس کے تحت انتخاب کا ایک معیار مقرر فرمایا۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت نقل کی ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک دن حضرت ابو ہیثم بن تیہان انصاری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خوب مہمان نوازی کی مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ ان کے پاس کوئی خادم نہیں تو فرمایا کہ جب ہمارے پاس کچھ خادم آئیں تو آپ رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئیں۔ چناں چہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف دو غلام آئے اور ادھر سے حضرت ابو ہیثم رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"اختر منهما." (ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرلو) انھوں نے عرض کیا: حضور! آپ ہی میرے لیے انتخاب فرمادیں۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن المستشار مؤتمن، خذ هذا فإني رأيته يصلي واستوص به معروفا." (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔ تم پھر یہ غلام لے لو، میں نے اسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، میں تمھیں اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی نصیحت بھی کرتا ہوں)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔[۵۰] انھوں نے أبواب الأدب میں ایک باب بھی اسی عنوان سے قائم کیا ہے۔ امانت ایک ایسا اہم عمل ہے جس کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تقریر فرمائی ہو اور یہ نہ فرمایا ہو: "لا إيمان لمن لا أمانة له، ولا دين لمن لا عهد له." [۵۱] (جس میں امانت نہیں اس کا ایمان ہی نہیں، اور جس کا عہد نہیں اس کا دین ہی نہیں)۔ گویا ووٹ صرف اسی کو دیا جائے جو اہلِ وطن کی دینی و دنیوی بھلائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

بعض علما نے ووٹ کو شہادت یعنی گواہی شمار کیا ہے، چوں کہ حکومت کی منظوری سے کچھ لوگ نئی حکومت کے مناصب سنبھالنے کے لیے اپنے نام پیش کرتے ہیں اور حکومت عوام سے کہتی ہے کہ اپنے ووٹ کے ذریعے بتاؤ کہ یہ اس قابل ہیں یا نہیں تو اس صورت میں سرٹیفیکیشن، تزکیہ یا ان کے اس قابل ہونے یا نہ ہونے کی گواہی ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے بھی ووٹ اہل لوگوں کو دینا ووٹر کی ذمہ داری ہے، قرآنِ مجید کہتا ہے: ﴿ وَأَقِيمُواْ ٱلشَّهَٰدَةَ لِلَّهِ ﴾[۵۲] (گواہی اللہ کے لیے قائم کرو)۔

۵۰- سنن الترمذي،أبواب الزهد، باب ماجاء في معيشة أصحاب النبي ﷺ ،حديث: ۲۳۶۹

۵۱- مسند الإمام احمد، مسند أنس بن مالک حدیث: ۱۲۳۸۳

۵۲- الطلاق: ۲

تیسری حیثیت وکالت نامے کی بتائی جاتی ہے کہ لوگ انھیں اپنی طرف سے ووٹ کی شکل میں وکالت نامہ دے کر اپنی جانب سے حکومت میں مختار بناتے ہیں کہ جو کچھ تم کروگے وہ ہماری طرف سے شمار ہوگا اور ہم اس کے ذمے دار ہوں گے، راقم کے نزدیک یہ حیثیت بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔

ووٹ کی چوتھی حیثیت شوریٰ میں مشورے کی بتائی جاتی ہے، یہ بھی مناسب ہے۔ اس لحاظ سے ووٹر سے حکومت مشورہ مانگتی ہے کہ ان لوگوں کو کاروبارِ حکومت میں شامل کرلیں یا نہیں تو ہر ووٹر اپنی رائے دیتا ہے۔ یہ حیثیت شہادت اور امانت دونوں سے قریب تر ہے۔ جس سے خیر کا مشورہ مانگا جائے اس کا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ خیر خواہانہ مشورہ دے اور دوسری طرف جس سے مشورہ مانگا جائے حدیث پاک میں اسے "مؤتمن" یعنی امانت رکھنے کے برابر قرار دیا گیا ہے جیسے کہ ابھی گزر چکا۔ مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ووٹ کی تین شرعی حیثیتیں بیان کی ہیں۔ دو تو اوپر ذکر ہو چکی ہیں (شہادت اور وکالت)۔ ان دو کے علاوہ مفتی صاحب نے مزید ایک حیثیت ذکر کی ہے ان کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

> دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے۔ اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے "و من يشفع شفاعة يكن له نصيب منه و من يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها." یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بُری سفارش کرتا ہے تو اس کی بُرائی میں اس کا بھی حصہ لگتا ہے، اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانتدار آدمی کی سفارش کرے جو خلق خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بُری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق، ظالم کی سفارش کر کے اس کو خلق خدا پر مسلط کرے۔ (۵۳)

ووٹر کی اہلیت

جدید طریقۂ انتخاب میں رکنیتِ اسمبلی کے امیدوار کی اہلیت اور کوائف کا ذکر تو آتا ہے، مگر ووٹر کی اہلیت کا سوال کبھی نہیں اٹھایا گیا۔ اس صورت حال سے جدید جمہوری طریقۂ انتخاب اور مسلم معاشرے کے روایتی طریقِ انتخاب میں خلا بہت بڑھ جاتا ہے۔ راقم ناچیز کے خیال میں امیدوار اور ووٹر دونوں کی اہلیت کے کچھ کوائف مقرر ہو جائیں تو یہ خلیج کم ہو سکتی ہے اور معاشرہ دہشت گردی، مالی بے ضابطگیوں، لوٹ کھسوٹ اور قبضہ مافیا جیسی کئی مہلک بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ اسی بات کو مسلم تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی جائے تو معلوم

۵۳- مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، جواهر الفقة، دیوبند، مکتبہ سیرت النبی، ج۳، ص ۲۹۳

ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں حکم ران کا انتخاب معاشرے کے معتبر افراد کیا کرتے تھے اور باقی لوگ ان کی اتباع میں بیعتِ اطاعت کیا کرتے تھے، کچھ لوگوں کی بیعت نہ کرنے سے خلیفہ کی تعیین میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، بلکہ تمام مسلمانوں کے مقابلے میں شاذ موقف اختیار کرنے کی وجہ سے ان لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا جاتا تھا۔ معاشرے کے ان معتبر افراد کو اصحاب الرائے اور اہل الحل والعقد کہا جاتا تھا۔ اس طریقۂ انتخاب کی بہت سی وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں، مثال کے طور پر یہ کہ اس وقت دورِ جدید کی طرح ذرائع ابلاغ نے ترقی نہیں کی تھی اور خلیفہ یا امیر المؤمنین کے انتخاب کے لیے تعارفی مہم چلا کر پورے ملک کے لوگوں کو امیدوار یا مجوزہ شخصیت کی اہلیت اور صلاحیت کا تعارف کروانا اور اس کے انتخاب کے لیے ہر شخص سے رائے لینا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ خلیفہ کا انتخاب معاشرے کا اہم ترین انتخاب ہوتا ہے اس کے لیے ووٹر کی اہلیت کا مسئلہ بھی شاید پیش نظر ہوتا ہو کہ خلیفہ کا منصب در اصل زمین پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کا سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس کے انتخاب کے لیے انہی لوگوں کی رائے کو معتبر سمجھا جاتا تھا جو امت کے اجتماعی مفادات اور دینی دنیوی مصلحتوں کو سمجھتے اور ان پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں، آج اگر سولہ سترہ گریڈ کے افسر کے لیے مقابلے کا امتحان ضروری ہوتا ہے اور اس کی قابلیت کو ایک خاص معیار پر خاص تجربے کے حامل لوگ ہی جانچ سکتے ہیں، فوج میں کمیشن کے لیے خاص امتحان اور خاص قسم کے لوگوں کی آزمائش سے گزرنا ضروری قرار پاتا ہے، بلکہ دور جدید میں کسی نہ کسی انداز میں حکومتی عمل میں شامل ہونے والے ہر نمائندے کے کچھ نہ کچھ کوائف مقرر کیے جاتے ہیں تو ووٹر کے لیے بھی کچھ نہ کچھ معیار مقرر کرنا کوئی بے انصافی کی بات نہیں۔ اگر خلیفہ یا مسلمانوں کے امیر کا انتخاب ذہنی پختگی کے ایک خاص معیار کے حامل لوگ کریں تو یہ عین حکمت کی بات ہے۔ بعد میں موروثی حکومت کا ایک سلسلہ چلا جو صدیوں تک جاری رہا۔ پھر جدید دور آ گیا جس میں جمہوریت کا نظام متعارف ہوا۔ عام لوگوں کو اس عمل میں شامل کرنا شریعت کے منافی نہیں ہے، شریعت نے اس پر پابندی بھی نہیں لگائی جیسے کہ حضرت علی ؓ کی روایت نقل کی جاچکی ہے۔ اصل مقصد لوگوں کے حقوق اور مصالح کا تحفظ ہے وہ جس طریقے سے بہتر انداز میں میسر آسکتا ہو شریعت اس میں کھلے دِل سے عرف کے اصول کے تحت اس پر کوئی پابندی نہیں لگاتی، صرف ایک بات کی پابندی ہے کہ کسی اقدام سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ اگر ایسا ہو تو "جو چیز حرام کا سبب بنے وہ بھی حرام ہوتی ہے۔"

امیدواروں کی اہلیت کے بارے میں خاصی بات ہوچکی۔ ووٹر کی اہلیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وسنت میں ووٹر کے الفاظ تو ہمیں ملنے سے رہے۔ ان دونوں مصادرِ اصلیہ کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق یہ معلوم ہوتا

ہے کہ ہر مسلم معاشرے کا ہر شہری بنیادی طور پر عادل اور اہل ہے۔ البتہ اگر وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جو اس کی امانت، گواہی، یا مشورہ دینے کی اہلیت ختم کر دے تو اس کے بارے میں قانون سازی کی ضرورت ہے، علماے دین اور اربابِ علم ودانش کو جمع کر کے اہلیت کے دیگر معاملات کے ساتھ اسے بھی شامل کر کے اس پر غور کرنا اور اس کا فیصلہ کرنا متعلقہ حکام کی ذمہ داری ہے۔ شہادت کی اہلیت ختم ہونے کی ایک مثال قرآنِ مجید میں اس شخص کے بارے میں قرآنی حکم ہے کہ جو شخص جرم قذف کا ارتکاب کرے اور ثابت ہونے کے بعد وہ حد کا سزاوار قرار پائے اس کی گواہی کبھی قبول نہ کی جائے۔ اس طرح مثالیں سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

عام انتخابات کے بعد خاص انتخابات اور مناصب پر تقرر

اسلامی سیاسیات میں ہر منصب کو ولایت کا نام دیا گیا ہے اور منصب حکومت کو "الولایۃ الکبریٰ" کہا گیا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی بنیادی شرائط کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے بعد ہر منصب کے لیے تین صفات (علم، قوت اور امانت داری) بنیادی طور پر ضروری ہیں اور ہر منصب کے لحاظ سے علم، امانت اور قوت کی تعریف اس منصب کی ذمہ داریوں کے مطابق ہو گی۔ منصب، عسکری نوعیت کا ہو گا تو قوت سے مراد جرأت وجواں مردی اور علم سے مراد جنگی امور کا علم اور تجربہ ہو گا جس میں جنگی چالوں کو سمجھنا، مختلف قسم کا اسلحہ چلانا اور دشمن کی متوقع چالوں سے واقف ہونا اور امانت داری سے مراد دین اور ملک وقوم کے ساتھ وفادار ہونا ہو گا۔[۵۴] اگر منصب سیاسی ہے تو قوت سے مراد قوتِ فیصلہ اور علم سے مراد امورِ سیاست میں شریعت کی ہدایات، تاریخِ اسلامی کے تجربات اور عصرِ حاضر کے امور سیاست، جغرافیے اور زمینی حقائق سے واقفیت اور بین الاقوامی حالات سے واقفیت اور تعلقات کا تجربہ ہے جب کہ امانت داری یہی ہے کہ دین، امتِ اسلامیہ اور ملک کے لیے ہر حال میں مخلص رہے۔ نہ تو محض دولت مندی ان مناصب کے اہل بناتی ہے اور نہ اکیلا اصلاح وتقویٰ، بلکہ بنیادی شروط کے بعد ہر منصب کی نوعیت کے مطابق قابلیت کا فیصلہ کرنا قرآن وسنت کا تقاضا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کے ایمان اور عملِ صالح کا مقام تو یہ ہے کہ قرآنِ مجید ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتا، کبھی انہیں "مفلحون" (کام یاب) کہتا ہے، کبھی "مؤمنون حقا" (ایسے مومن جیسے مومن ہونے کا حق ہے)، "صادقون" (سچے) اور بہت کچھ جن سب

۵۴- ابن تیمیہ، **السياسة الشرعية في أصلاح الراعي والرعية**، المملكة العربية السعودية، وزارة الشئون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد، ط۱، ۱۴۱۸ھ، ج۱، ص ۱۵-۱۹

صفات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے (التوبة : ۱۰۰) بلکہ انہیں دوسروں کو ایمان کے لیے معیار قرار دیا ہے (البقرۃ : ۱۳۷)۔ اس کے باوجود جب مناصب کی باری آتی ہے تو انھی ایمان کے پکے، دِل کے سچے اور خلوص کے کھرے صحابہؓ میں فرقِ اختیار پایا جاتا ہے۔ بھلے وقتوں میں جب مسلمان حکومت کے قابل ہوا کرتے تھے، بہت سالٹریچر تیار ہوا، جس میں عام فقہی کتابوں میں سیاسی اور انتظامی مسائل کے ابواب کے علاوہ سیاسی امور پر زیادہ تر **الأحكام السطانية** کے عنوان سے، انتظامیات پر **تذكرة الحكام** اور **تبصرة الحكام** طرز کی کتابیں اور سرکاری خط و کتابت، ریکارڈ اور دیگر سرکاری امور کے ڈرافٹس، نمونوں پر مشتمل **أدب الكتاب** اور قلقشندی کی **صبح الأعشى** طرز کی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو آج بھی کہیں مخطوطہ اور کہیں مطبوعہ شکل میں گل سڑ رہی ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہلاکو اور چنگیز کی تباہ کاریوں سے گزر کر آنے والے اسلامی معاشرے کے لیے اپنے دور میں سیاسی اور انتظامی رہ نمائی پر مشتمل کتابیں لکھیں۔ ظاہر ہے اس دور میں مسلمانوں میں مکمل باصلاحیت لوگ کہاں ملتے تو انھوں نے ہمارے لیے آسانی کر دی اور "الأصلح فالأصلح"[۵۵] یعنی سب سے زیادہ باصلاحیت اور اس کے بعد اس سے کم باصلاحیت کی اصطلاح متعارف کروائی اور اس کے لیے قرآن و سنت اور حیاتِ ائمہ سے مثالیں نقل کیں۔ ان میں سے چند ایک یہاں اس غرض سے پیش کی جا رہی ہیں کہ ہم کہیں عہدِ نبوت یا دورِ خلافتِ راشدہ کا انتظار کرتے کرتے زندگی تمام نہ کر بیٹھیں، بلکہ عقل مندی یہ ہے کہ موجود معاشرے میں سے ایسے لوگوں کو اہل قرار دے لیں جو سب سے بہتر باصلاحیت نظر آ جائیں، ایمان اور عملِ صالح کے لحاظ سے بھی اور عہدے کی اہلیت کے لحاظ سے بھی، تو پہلے انہیں امیدوار بننے کی اجازت دیں اور اس کے بعد درجہ بہ درجہ اسی اصول کو سامنے رکھ لیں۔ اس کی چند اہم مثالوں میں سے ایک حضرت عمرؓ کی دعا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے: " اللهم أشكو إليك جلد الفاجر وعجز الثقة."[۵۶] (اے اللہ میں تیرے دربار میں برے آدمی کے باہمت ہونے اور معتبر آدمی کے بے ہمت ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔) مثال کے طور پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے صدق و امانت کی مثالیں صحابہؓ میں مشہور تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی امانت و دیانت کی بہت واضح تعریف فرمائی، دوسری طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے جو عظمت و جلالت قدر

۵۵- نفس مصدر، ص ۱۲

۵۶- نفس مصدر، ج ۱، ص ۱۵

میں کسی سے کم نہ تھے تاہم زہد میں شاید حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا مقام ان سے خاصا بلند تھا۔ بنو جذیمہ کے خلاف جنگ میں حضرت خالدؓ نے انھیں اِسلام کی طرف دعوت دی، انھیں "أسلمنا" (ہم مسلمان ہوگئے) کہنے کی سمجھ نہیں تھی، انھوں نے کہہ دیا "صبأنا" (ہم صابی ہوگئے) تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان میں سے کچھ کو قتل کر دیا، کچھ کو قیدی بنالیا اور بعد میں جو قیدی بنائے تھے ان میں سے اکثر کو قتل کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ناراضی کا اظہار بھی فرمایا اور دو بار یہ الفاظ فرمائے: " اللّٰهُمَّ إِنِّي أَبْرَأُ إِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ. "(۵۷) (اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا ہے اس سے میں تیرے سامنے براءت کا اظہار کرتا ہوں)، اس کے باوجود انہیں سیف اللہ کا لقب بھی دیا، ہمیشہ انھیں افواج کا سپہ سالار بھی بناتے تھے۔ دوسری طرف حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کسی منصب پر تقرر کی درخواست کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے سینے سے لگا کر کمالِ حکمت سے دل جوئی تو فرمادی مگر منصب پر تقرر نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد فرمایا: "يَا أَبَا ذَرٍّ، إِنِّي أَرَاكَ ضَعِيفًا، وَإِنِّي أُحِبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِي، لَا تَأَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ، وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ."(۵۸) (اے ابوذر! مجھے نظر آرہا ہے کہ تم کمزور ہو، میں تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو مجھے اپنے لیے پسند ہے: تم کبھی دو آدمیوں کا امیر بھی نہ بننا اور کبھی یتیم کے مال کی سرپرستی قبول نہ کرنا)۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وجہ خوب بتائی، ان سے پوچھا گیا کہ جنگ میں اسلامی لشکر کا سربراہ بنانے کے لیے دو قسم کے آدمی سامنے ہوں تو کسے یہ منصب سپرد کیا جائے، ایک وہ جو جرأت مند ہو مگر بد عمل ہو اور دوسرا وہ جو نیک ہو مگر کمزور دِل والا ہو، انھوں نے فرمایا: جو بد عمل ہے مگر جرأت مند ہے تو اس کی جرأت مندی مسلمانوں کے کام آجائے گی اور بد عملی کا نقصان اسے خود اٹھانا پڑے گا، جب کہ نیک آدمی کی نیکی اس کی اپنی ذات تک محدود رہے گی اور جنگ میں اس کی بے ہمتی کا نقصان سب مسلمانوں کو اٹھانا پڑے گا۔(۵۹) ہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اور ہمارے دور کی بد عملی میں بھی فرق ہوگا۔ اپنے دور میں ہم ان اصولوں کے تحت گزارہ چلا سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ ان

۵۷- **صحيح البخاري**، كتاب المغازي، باب بعث النبي ﷺ خالد بن الوليد إلى بني جذيمة، حديث:۴۳۳۹

۵۸- **صحيح مسلم**،كتاب الإمارة، بَابُ كَرَاهَةِ الْإِمَارَةِ بِغَيْرِ ضَرُورَةٍ، حديث:۱۸۲۶

۵۹- ابن تیمیہ، مصدرِ سابق، ج۱، ص۱۵

کوائف کی فراہمی کے انتظامات اور کوشش کرتے رہنا ہمارا فرض ہے۔ اگر خدانہ خواستہ کہیں بنیادی صلاحیتیں ہی مفقود ہوں تو نااہلی پر بھی غور کرلیں، جس امیدوار سے دین، وطن اور اہلِ وطن کو نقصان پہنچنے کا کم اندیشہ ہو اسے اولیت دے دیں۔

یہ مضمون ایک طالب علمانہ تحقیقی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے جو اہلِ علم کے غور فکر کے لیے پیشِ خدمت کیا گیا ہے۔ عملی اقدامات کے لیے یقیناً اجتماعی اجتہادی فکر کے ساتھ اپنے معاشرے کی دینی دنیوی اصلاح و ترقی کے لیے کام کرنا ہر شہری کا فرض ہے، واللہ یتولی السرائر.

❁❁❁❁❁❁